علامہ اقبال کی ممدوح باضمیر جرمن قوم

جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی پس منظر

انجینئر مختار فاروقی

انسانوں کی طرح قوموں کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے۔ فرد انسانی کی طرح قومیں بھی سوتی اور جاگتی ہیں زندہ ضمیر اور بے ضمیر بھی ہوتی ہیں۔ قومیں زندہ بھی ہو جاتی ہیں اور مر بھی جاتی ہیں۔ چند مستثنیٰ پہلوؤں کو الگ کر کے دیکھیں تو اجتماعیت یا قومیں بھی فرد واحد کی طرح عمل سے گذر کرتی ہیں اور ردِعمل کا مظاہرہ بھی کرتی ہیں۔ یہ اجتماعیت نظریاتی بھی ہوتی ہے اور غیر نظریاتی بھی۔ رنگ و نسل، علاقہ، زبان، ثقافت اور جغرافیائی تقسیم کی بنیاد پر بھی اجتماعیتیں ہیں۔ ان میں کئی اجتماعیّتوں پر لفظ قوم کا اطلاق ہوتا ہے اور کئی اجتماعیّتوں پر اس لفظ کا اطلاق محل نظر ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے قوموں کے اس مزاج کے بارے میں چھٹے پارے کے آخر میں ایک تقابلی جائزہ دیا ہے جس سے ایک مسلمان کے لیے اقوام عالم اور دیگر اجتماعیّتوں کے مزاج کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (المائدۃ:۸۲)
>
> (اے پیغمبر) تم دیکھو گے کہ مؤمنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مؤمنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

ان مذہبی قوموں کے افراد اپنے اچھے برے اعمال کے مطابق دیکھے جائیں گے مگر قرآن پاک کے مطابق مشرکین اور یہود مسلمانوں کے بارے میں سخت نفرت، بغض اور انتہائی دشمنی کے جذبات رکھتے ہیں جبکہ ـــــ نصاریٰ ان دونوں کے مقابلے میں اسلام دشمنی، قرآن دشمنی اور مسلم دشمنی میں ذرا کم ہیں۔ اس

تقابلی جائزے میں آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے کے ''نصاریٰ'' میں اور آج کے نصاریٰ میں بھی فرق ہوگا۔ تاہم یہ قیمتی اُصول قرآن پاک کا ہی دیا ہوا ہے۔ اقوام یورپ بنیادی طور پر مسیحی مذہب کی حامل ہیں اور نصاریٰ کہلاتے ہیں تاہم ان نصاریٰ میں سے بھی ایک عام مشاہدے کے اُصول کی رو سے

نہ ہر زن زن ست و نہ ہر مرد مرد
کہ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

سب نصاریٰ ایک جیسے نہیں ہوں گے۔ آج کے نصاریٰ میں سے ایک بڑا گروہ جو دیگر یورپی ترقی یافتہ اقوام کے مقابلے میں مسلمانوں کے بارے میں زیادہ نرم گوشہ رکھتا ہے ہمارے نزدیک وہ جرمن قوم ہے۔

علامہ اقبال آج سے ایک صدی قبل یورپ تشریف لے گئے تھے اور آپ نے کئی ممالک کو دیکھا تھا اور کئی قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا تاہم فرانسیسی، ڈچ برطانوی، اطالوی اور دیگر شمالی یورپی ممالک کے مقابلے میں مشرقی یورپ کے ملک جرمنی کو آپ نے ایک منفرد ملک اور جرمن قوم کو ایک منفرد قوم پایا۔ آپ نے جرمن قوم کو ایک اسلام دوست، علم دوست، حقیقت کے متلاشی اور حق کو قبول کرنے والی قوم کے طور پر دیکھا۔

ان باتوں کا بخوبی اندازہ علامہ اقبال کے منفرد مجموعۂ کلام پیام مشرق کے اشعار میں ہر قاری کو ہو جاتا ہے مزید برآں علامہ اقبال نے پیام مشرق کا جو دیباچہ تحریر فرمایا اس کے بین السطور جذبات کا ایک سمندر موجزن ہے۔ علامہ اقبال اس جرمن قوم میں اٹھارویں صدی کے خدا بیزار خدا ناشناس مغربی افکار کے سیلاب میں ''تحریک مشرقی'' کو ''اُمید کی کرن'' اور یورپ کے ایک کونے میں دھندلا سا ایک لائٹ ہاؤس (Light House) سمجھ رہے تھے۔

اٹھارویں صدی میں صہیونی اور یہودی ذہن نے دین اور سیاست میں جدائی پیدا کر دی تھی اور مذہب اور ریاست مدمقابل آ گئے تھے۔ خدا پرستی اور خدا شناسی یورپی معاشرے میں ایک کھوٹا سکہ شمار ہونے لگا تھا۔ اعلیٰ علمی حلقوں میں اور فلسفیانہ سطح پر یورپ سیکولرازم، سیکولر جمہوریت اور سیکولر معاشرے کی بنیاد رکھ چکا تھا اور یہی کام زیادہ سکون کے ساتھ بہت دور امریکہ میں بیٹھ کر یہی یہودی اور صہیونی لابی منظّم انداز میں بھی آگے بڑھا رہی تھی۔ ایک مثال بطور اشارہ کافی ہے کہ امریکہ میں طویل خانہ جنگی کے بعد برطانیہ سے آزادی حاصل کی گئی (جو برطانیہ آج اسی امریکہ کا طفیلی ہے) اور جمہوریت قائم ہوئی۔ آئین بنا، ۱۷۷۶ء کا سال امریکہ کی آزادی کا سال ہے امریکی کرنسی ڈالر ہے اور ایک ڈالر کے نوٹ پر (تاکہ غریب سے غریب امریکی کے ہاتھ میں یہ پیغام ہر وقت رہے اور اس کی جیب میں محفوظ ہو) آج بھی Ordo Novo Seclorum کے الفاظ کندہ ہیں اور ۱۷۷۶ء کا سن درج ہے۔

اس ماحول میں جرمن ذہن کا ایک فلسفی Kant (۱۷۲۲ء-۱۸۰۴ء) اخلاقی اُصول، ضمیر اور Reality کے لیے لڑ رہا تھا اور خالص عقلیت پرستی کے خلاف سینہ سپر تھا۔ اُس نے *Critique of Pure Reason* لکھ کر عقلیت پرستی کا منہ بند کر دیا مگر یہودی اور صیہونی طاقتوں کے درپردہ دباؤ اور عزائم کے سامنے یہ فکر پنپ نہ سکا اور دم توڑ گیا۔

اس پس منظر میں جرمنی کا شاعر گوئٹے اور اس سے پہلے دیگر دانشور ترکی، ایران، افغانستان میں اسلام اور اسلامی لٹریچر میں جاری و ساری خدا پرستی اور خدا شناسی کے جذبات کے اسیر ہو چکے تھے۔ یاد رہے کہ شاعری، ادب (لٹریچر) آرٹ، فن تعمیر وغیرہ کسی قوم کے نظریات و اعتقادات کا ہی عکس ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی شاعری اور ادب کا جرمن دانشور طبقہ اسیر ہو رہا تھا تو وہ دراصل اسلام کے الہامی نظریات و عقائد ہی تھے اور Kant کی سوچ ہی تھی جو کہیں پروان چڑھ رہی تھی۔

اس ''تحریک مشرقی'' کا سحر تھا جو علامہ اقبال کے جرمنی کے قیام میں ایران کی تاریخ کے مطالعے کے دوران ان کے سامنے آیا (یاد رہے ایران، افغانستان، پاکستان ماضی میں ہمیشہ اس طرح نہیں رہے جیسے آج ہیں۔ ان کی سرحدیں، ادلتی بدلتی رہی ہیں ایران کا بادشاہ نادرشاہ آج کے جنوبی افغانستان پاکستان سمیت دہلی تک کا حکمران تھا، احمد شاہ ابدالی کا دارالحکومت قندھار تھا اور دہلی تک حکمرانی کر رہا تھا) جس سے آپ کی سوچ کے کئی اور دریچے کھل گئے۔ جرمنی جیسے یورپی ملک میں ''فلسفۂ عجم'' اور ایران میں مذہبی رجحانات کی تاریخ پڑھنا، اس پر کتاب لکھنا اور اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنا ــــــ یہ واقعات اس بات کے غماز ہیں کہ جرمنی میں ان مسلمان ممالک کے بارے میں ایک ہمدردانہ سوچ پائی جاتی تھی۔ وہاں علامہ اقبال کے نام سے ایک شاہراہ موسوم کی گئی جو آج بھی موجود ہے۔

جرمنی میں تحریک مشرقی کا اجرا اور فروغ، جدید یورپ میں ایک منفرد واقعہ ہے اور اس کا ماضی کے دھندلکوں میں پھیلا ہوا ایک حیران کن پس منظر ہے جس کی طرف پاک و ہند کے مسلمانوں کی نگاہیں نہیں اُٹھ سکیں۔ یہ پس منظر ماضی کی کم از کم تین صدیوں پر محیط ہے۔ آج کی جرمن قوم کے اس ماضی میں جھانک کر دیکھیں تو یہ منظر روز روشن کی طرح واضح بھی ہے اور حقیقی بھی۔ اس پہلو کو سامنے نہ لانے کی سب سے بڑی وجہ جرمنی کے روایتی حریف برطانیہ کا افریقہ، جنوبی ہند اور مشرق وسطی پر تسلط ہے جس کے ہم غلام تھے اور بالعموم ہمارے دانشور اور نوجوان برطانوی درسگاہوں تک ہی رسائی حاصل کرتے رہے یا آج امریکہ جا رہے ہیں۔ یہ بات فطری ہے کہ یہ برطانیہ اپنے دشمن جرمنی کے بارے میں عوامی سطح کی معلومات اور تعلیمی اداروں کے ماحول کی کتابوں کے مواد میں وہی معلومات دے سکتا تھا جو اس کے مفاد میں ہوں۔

جرمنی ـــــــ برطانیہ دشمنی واضح طور پر پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) سے ربع صدی قبل سے لے کر ۱۹۰۰ء میں دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے بعد تقسیم جرمنی کی واضح لکیر کے طور پر بنائی گئی دیوار برلن کے گرنے تک قائم رہی ہے۔ چونکہ ہمارا ماضی قریب تحریک آزادی، قیام پاکستان اوراس کے بعد کے ساٹھ سال زیادہ تر اسی دور کے ہیں؛ لہٰذا ـــــ ہمارے ذہنوں پر بھی برطانیہ جرمنی مخاصمت کی وجہ سے تالے پڑے رہے اورعوامی سطح پر کوئی دریچہ اس طرف کھل نہیں سکا۔

مسلمان اور جرمن قوم کے باہمی تعلقات (Interaction) کی اس تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے ہم درج ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ (ہماری معلومات کم ہیں۔ اہل علم اور دانشور طبقہ کے باصلاحیت لوگ اس میں آگے بڑھیں گے تو مزید پہلو بھی سامنے آتے چلے جائیں گے۔)

۱- جغرافیائی پہلو
۲- تہذیبی اور ثقافتی پہلو
۳- تاریخی پہلو
۴- معاشی/سیاسی پہلو
۵- صہیونی عزائم

آیئے ان پہلوؤں پر ترتیب وار گفتگو کرتے ہیں:

عالم اسلام اور جرمنی ــــ جغرافیائی پہلو

جغرافیائی پہلو پر گفتگو کا تقاضا ہے کہ ہم پہلے یورپ، افریقہ اور ایشیا کے نقشے کو نگاہوں کے سامنے کر لیں تاکہ بحث کا مقصد سمجھنے میں آسانی پیدا ہو سکے۔

۱- یورپ کے نقشے پر نگاہ مرکوز کریں تو سب سے اوپر علیحدہ ملک UK یا برطانیہ ہے اس سے دائیں طرف ذرا فاصلے پر سکینڈے نیوین مما لک یعنی ناروے، سویڈن اور ڈنمارک وغیرہ ہیں۔ نیچے کی طرف آئیں تو براعظم یورپ کا بڑا حصہ شروع ہوتا ہے۔

برطانیہ سے نیچے چھوٹا سا ملک بلجیم ہے بائیں طرف نیچے فرانس ہے مزید بائیں طرف سپین ہے جسے ماضی میں ہسپانیہ بھی کہا جاتا تھا اور مسلم عہد ۷۱۱ء تا ۱۴۹۲ء میں اندلس کہا جاتا تھا (یورپ کے نقشہ سے کسی مسلم دشمن غیبی قوت نے ملک کا نام ہی بدل دیا تاکہ نقشہ دیکھتے ہی احساس نہ ہو کہ یہاں کبھی مسلمان بھی آباد تھے اور آٹھ صدیاں حکمران رہے ہیں۔ مسلمان نوجوان اپنی تاریخ میں اندلس کا پڑھ کر نقشے دیکھتا پھرے اُسے اس نام کا ملک کہیں نہیں ملے گا) اس سے مغربی طرف پرتگال ہے۔

بلجیم سے دائیں طرف آج کا جرمنی ہے نیچے کی طرف اٹلی ہے یاد رہے کہ اٹلی کے اندر ہی چھوٹی سی سلطنت ویٹی کن ہے جو عیسائیت کا عالمی مرکز ہے اور عیسائی مذہب کا پوپ اعظم وہیں بیٹھتا ہے۔ عیسائیت کے فروغ اور نگرانی کا کام یہیں سے ہوتا ہے اس سلطنت اور اس کے تحت چلنے والی عالمی مسیحی مشنری چرچ اور سکولوں کے اخراجات یورپی مسیحی ممالک مل کر پورا کرتے ہیں (یہ ممالک بظاہر سیکولر اور آزاد خیال ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔)

جرمنی کے دائیں طرف پولینڈ، چکوسلواکیہ، کروشیا، رومانیہ، بوسنیا، ہرزگووینا اور کئی چھوٹے چھوٹے ممالک ہیں۔ یورپ کا شمال مشرقی حصہ ایشیا میں روس سے ملحق ہے اور شمالی ترکستان کہلاتا ہے جبکہ مشرقی حصہ میں ترکی، یونان اور قبرص آتے ہیں۔ ملک ترکی کا کچھ حصہ یورپ براعظم میں ہے اور کچھ حصہ براعظم ایشیا میں ہے۔

براعظم یورپ سے نیچے بحیرہ روم پھیلا ہوا ہے سپین سے نیچے یورپ براعظم افریقہ سے ملا ہوا ہے، سمندر کی چوڑائی ۳۰-۴۰ کلومیٹر ہے۔ (یہیں جبل الطارق ہے جہاں ۷۱۱ء میں مسلم جنرل طارق بن زیادہ رحمہ اللہ شمالی افریقہ سے یورپ میں داخل ہوا تھا اور کشتیاں جلا کر داخل ہوا تھا کہ ہمارا واپس جانے کا ارادہ نہیں یا فاتح ہوں گے یا مر جائیں گے۔ اسی کے بعد سپین کی مسلم سلطنت قائم ہوئی اور آٹھ صدیاں یورپ میں علم کی روشنی پھیلاتی رہی جبکہ یورپ ظلمت و جہالت کی Dark Ages میں تھا)۔

شمالی افریقہ کے ممالک میں دائیں طرف مصر ہے پھر لیبیا، پھر الجزائر اور مراکش ہیں (لیبیا اور الجزائر کے جنوبی حصے میں دنیا کا سب سے بڑا صحرا صحرائے اعظم ہے) نیچے بہت سے چھوٹے چھوٹے مسلم ممالک ہیں جنوبی افریقہ کے ممالک میں مسلمان کم اور عیسائیت زیادہ ہے۔ بحیرہ روم کے مشرق کی طرف اسرائیل (فلسطین) ہے پھر لبنان، شام اور اوپر ترکی کا حصہ لگتا ہے۔ ان ممالک سے مزید مشرق کی طرف آئیں اسے مشرق وسطی کہتے ہیں یہ ممالک اردن، عراق ــــ نیچے کی طرف کویت اور امارات ہیں۔

اس سے نیچے سعودی عرب ہے مزید نیچے کی طرف جزیرہ نمائے عرب میں یمن (شمالی یمن اور جنوبی یمن) اور اومان ہیں۔

جزیرہ نمائے عرب کے مغرب میں بحیرہ قلزم ہے جو مصر اور سعودی عرب کے درمیان واقع ہے۔ مشرقی طرف خلیج فارس ہے، ایران کی سلطنت ہے ترکی سے مشرق کی طرف اوپر روسی علاقہ جات ہیں جو کبھی USSR کہلاتا تھا آج آزاد مسلم ریاستیں ہیں پھر مشرق کی طرف افغانستان ہے پھر پاکستان، اس سے مشرق کی طرف کشمیر اور بھارت ہے۔ بھارت سے مشرق کی طرف مسلم ملک بنگلہ دیش ہے جو ۱۹۷۱ء سے پہلے مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔ بھارت سے نیچے جنوب کی طرف سری لنکا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ساتھ جزائر مالدیپ ایک خوشحال مسلمان ریاست ہے۔

برطانیہ (دراصل جزائر برطانیہ ہیں) کو چاروں طرف سے سمندر لگتا ہے، فرانس کو شمال اور جنوب میں طویل ساحل میسر ہے۔ اٹلی کو جنوبی ساحل میں بحیرہ روم تک رسائی حاصل ہے۔ پرتگال کو مغربی طرف بحیرہ اوقیانوس میں طویل ساحل لگتا ہے۔ ساحلی علاقہ لگنے سے ماضی میں اور آج بھی سمندری تجارت کے مواقع میسر ہیں۔ بحیرہ روم اور پرتگال کے ساحل گرم سمندر ہیں اور سارا سال تجارت ہوسکتی ہے جبکہ برطانیہ کے شمالی اور مشرقی حصہ میں سمندر منجمد ہو جاتا ہے اور جنوبی حصہ میں سارا سال تجارت ہوسکتی ہے۔ سکینڈے نیوین ممالک میں سمندر منجمد ہو جاتا ہے اور سال کے چند ماہ ہی سمندری تجارت ممکن ہوتی ہے۔

جرمنی ملک کو شمالی طرف مختصر سا سمندر لگتا ہے اور اس میں سارا سال تجارت نہیں ہوسکتی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران تجارت کے لیے جانے والے سمندری جہازوں کو دشمن برطانیہ اور فرانس کی نیوی سے واسطہ پڑتا تھا۔

جرمنی اور اس کے ملحقہ ممالک سے مختصر تعارف کے بعد اب جرمنی کے مسلمانوں سے تعلقات کا جغرافیائی پہلو سامنے آسکے گا۔

جرمنی زمینی طور پر مشرق کے آج کے یورپی مسلمان ممالک ترکی، ایران، افغانستان، اردن، عراق اور سعودی عرب سے جڑا ہوا تھا، جرمنی کے لوگ ان علاقوں میں زمینی راستوں (by road) سے منسلک ہیں اور جہاں ریلوے کا نظام آ گیا تھا وہاں سفر بڑا آسان تھا اور یہ سہولت صدیوں سے میسر تھی؛ لہٰذا ـــ ان علاقوں کے باشندوں کا آپس میں میل جول، تجارت اور رابطے صدیوں کی تاریخ رکھتے تھے۔ ان رابطوں سے یہاں کے عوام ایک دوسرے کو جانتے اور ایک دوسرے کے رجحانات وخیالات اور ماضی سے واقف تھے۔

صرف تقابلی جائزے کے لیے چند لمحے اس پر غور فرمائیں کہ جرمنی کے برعکس برطانیہ فرانس، اٹلی کو مشرق وسطی، عثمانی سلطنت اور جنوبی ہند سے رابطے میں جغرافیہ حائل ہے کوئی براہ راست آسان زمینی یا سمندری راستہ نہیں تھا۔ پرتگالی انڈونیشیا، ملائیشیا گئے تو جنوبی افریقہ راس امید ہوکر واپس خلیج فارس، سری لنکا اور پھر وہاں پہنچے۔ اسی طرح برطانیہ کو بنگال پہنچنے کے لیے ۷۰۰۰ یا ۸۰۰۰ میل کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔

جغرافیہ نے برطانیہ فرانس، اٹلی، پرتگال کے لیے صنعتی انقلاب کے بعد سلطنت عثمانیہ کی صورت میں متمدن دنیا سے رابطے میں مشکلات پیدا کی ہوئی تھیں۔

تہذیبی اور ثقافتی پہلو

اسلام یورپ میں مغرب کی طرف سپین سے تو آٹھویں صدی میں ہی آ گیا تھا اور آٹھ صدیاں چھایا رہا۔ غرناطہ شبیلیہ وغیرہ کی مسلم تہذیب کی تعمیرات آج بھی یورپی ماہرین اور انجینئرز کو ورطۂ حیرت میں ڈال

دیتی ہیں۔ مسجد قرطبہ اور الحمرا کا محل سیاحوں کے لیے بے پناہ کشش رکھتا ہے۔

یورپ میں مشرق کی طرف سے اسلام کے داخلہ میں رومی سلطنت حائل تھی کیونکہ ایشیا اور یورپ کے اتصال پر ہی اس سلطنت کا دارالحکومت تھا اور قسطنطنیہ بہت مضبوط قلعہ تھا اور عیسائیت کا بھی مرکز تھا۔ قبرص اور بعض یونانی علاقے ابتدائے اسلام ہی میں فتح ہو گئے تھے مگر یورپ میں اسلام عثمانیوں رترکوں کے دور میں وارد ہوا۔ پہلے قسطنطنیہ کے مغربی علاقوں سے مسلمان اندر تک گھس گئے اور سلطنت قائم کر لی۔ رومی سلطنت بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ بالآخر مشہور ترک حکمران سلطان محمد فاتح نے ہمت کر کے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کر لیا جس سے یورپ میں داخلے کا 'شاہدرہ' اسلام کے لیے کھل گیا۔ چنانچہ مسلمان افواج ایک وقت میں سارے مشرقی یورپ اٹلی، جرمنی سمیت فرانس میں پیرس کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔

موجودہ جرمنی تک کا علاقہ تین صدیاں عثمانیوں کے زیرنگین رہا۔ سپین میں مسلم دورِ حکومت کی طرح عثمانی حکومت کا دور بھی آسودگی، خوشحالی، فراوانی، علم دوستی، اقلیتوں سے حسن سلوک اور رحمدلی کا دور تھا۔ مسلمانوں کے اس فراخدلانہ طرزِ عمل سے مشرقی یورپ کے ان علاقوں کے باسی مسلمانوں سے مخاصمانہ کی بجائے دوستی اور انسانی ہمدردی کے لازوال رشتوں میں بندھ گئے۔ اس دوستی اور رابطوں (Interaction) کے نتیجے میں اسلام پھیلا اور سترہویں صدی تک مشرقی یورپ کے بیشتر لوگ مسلمان ہو گئے۔ اس طرح موجودہ جرمن قوم سے مسلمانوں کے روابط اور دوستی کا رشتہ گزشتہ پانچ صدیوں کی تاریخ رکھتا ہے اور اس علاقے کے مسلمان تو مسلمان ہیں' غیر مسلم بھی عثمانی دورِ حکومت کے انسان دوست اور اقلیتوں سے حسن سلوک کی بنا پر اچھے تأثرات رکھتے ہیں۔ بوسنیا، ہرزگووینا میں گزشتہ تین عشروں سے عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کی نسل کشی جاری ہے پھر بھی تاہم مسلمان اسلام پر قائم اور ڈٹے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں آزاد ہونے والی ریاست کوسووا (Kosova) دنیا میں ۵۸ ویں آزاد مسلم ریاست ہے۔

اس طرح تہذیبی رشتوں کے ساتھ مشرقی یورپ (حالیہ جرمنی وغیرہ) کے یہ علاقے عثمانی عہد سے مسلمانوں کے ساتھ تہذیبی اور ثقافتی روابط بھی رکھتے ہیں اور مشرقی یورپ کے یہ مسلم علاقے مسیحی یورپ کے لیے اسلام دوستی کا پیغام جبکہ مسیحی رویے ظالمانہ اور رومی طرز کے ہیں۔ مسلم مشرقی یورپ اب بھی UNO کے تحت دیے گئے اقلیتوں کے حقوق کے منتظر ہیں۔

عثمانی دور میں وسطی اور مشرقی یورپ کے لیے تجارتی اور سفارتی رابطوں کے مشرق میں ایران، افغانستان اور ہند تک سفر بلا روک ٹوک کرتے تھے اور مسلمانوں کی فراخدلی اور مہمان نوازی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاقی اقدار، پاکیزہ کاروباری اُصول، طرز بود و باش، کھیل کود کے مشاغل وغیرہ کا ذاتی تجربہ رکھتے تھے جو ان کی نسل در نسل روایات میں آج بھی موجود ہے۔

مشرق وسطیٰ، ترکی، مشرقی یورپ کی مسلم ثقافت کے آثار اس علاقے میں یکساں طور پر واضح ہیں طرزِ تعمیر، رہائش، لباس، کھیل کود کے مشاغل میں عثمانی ترکوں کے دور کے اثرات کا مشاہدہ ہر کھلی آنکھ کرسکتی ہے۔

تاریخی پہلو

تاریخی اعتبار سے سپین سے مسلم تہذیب و ثقافت کے اثرات مغربی فرانس اور برطانیہ تک بھی پہنچے اس لیے کہ عثمانی ترکوں کے عہد میں فرانس کے مشرقی علاقوں سمیت سارا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ تسلط رہا۔

۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فتح سے ترکوں کی حکومت مستحکم ہوگئی اور سارے یورپ میں کوئی مدمقابل قوت موجود نہ رہی۔ ۲۵۰ سال تک یہ علاقہ ترکوں کے زیرِ حکومت رہا اور یہاں مسلمانوں کی ترقی، علم دوستی، اقلیتوں سے حسنِ سلوک اور اعلیٰ تہذیبی روایات کا چرچا رہا۔ عثمانی حکومت اٹھارویں صدی کے آغاز تک شمالی افریقہ مشرقی یورپ، روسی ترکستان، مشرق وسطیٰ اور جزیرہ نمائے عرب کے شمالی اور مغربی حصے حجاز (جہاں حرمین شریفین واقع ہیں) تک محیط تھی۔

قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کا بھی ایک ضابطہ اور قانون ہے کوئی فرد ہو یا اجتماعیت وہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ اس اُصول سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں یہی سنہری اُصول بتائے گئے ہیں۔ اٹھارویں صدی شروع ہوئی تو عثمانی سلطنت پر زوال کے آثار رونما ہو گئے اور دوسری طرف یورپ میں صنعتی انقلاب آ گیا اور اقوام یورپ بیدار ہو گئیں اور مشرقی یورپ سے بھی علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلنے شروع ہو گئے اور ترکستان میں روس نے بیداری کے بعد توسیع پسندانہ جذبے سے عثمانی حکومت کے علاقے فتح کرنا شروع کیے۔ یہی زمانہ ہے جب برطانیہ اور فرانس نے اپنے ملکوں سے نکل کر بحیرہ روم کے شمالی اور مغربی ساحلوں پر لوٹ مار شروع کی اور اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔

اٹلی اور فرانس نے یورپ سے جنوب کی طرف بحیرہ روم عبور کر کے شمالی افریقہ میں عثمانی مقبوضات ہتھیا لیے۔ برطانیہ نے مغربی افریقہ کی طرف سے یلغار کر کے وسطی افریقہ میں علاقے فتح کرنا شروع کر دیے۔ تا آنکہ اٹھارویں صدی کے آخر تک (۱۸۰۰ء) افریقی مقبوضات عثمانیوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے، مشرقی یورپ کا بیشتر حصہ روس ترکستان کا حصہ بن گیا تھا اور باقی ریاستیں علیحدہ ہو کر خودمختار ریاستیں بن گئی تھیں، جن پر بعد میں روس نے قبضہ کر لیا تھا۔

اسلام اور جرمن قوم کے تعلقات کے حوالے سے دیکھیں تو جرمنی اور عثمانیوں کی آپس میں کشمکش ہونا یا کشیدگی ہونا تو سلطنتوں کے مابین فطری امور ہیں تاہم بڑی جنگ یا ایک دوسرے کو تہس نہس کر دینے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ حتیٰ کہ اٹھارویں صدی تک عثمانیوں نے فرانس سے بھی تجارتی تعلقات استوار کر لیے

تھے۔ اس بقائے باہمی کا نتیجہ یہ تھا کہ اٹھارویں صدی میں بھی مشرقی یورپ اور جرمنی کے لوگ ایران، افغانستان تک آزادانہ تجارت کر رہے تھے۔

اٹھارویں صدی میں عثمانیوں کے زوال پذیر ہونے اور یورپ میں صنعتی انقلاب سے، طاقت کا توازن صنعتی اقوام کے ہاتھ میں آ گیا۔ پہلے علم، ترقی، تہذیب وثقافت، کلچر رہن سہن کے انداز مشرق وسطی اور ترکی سے یورپ کو جا رہے تھے۔ یورپی اقوام کی سائنسی ترقی، صنعتی انقلاب سے صورت حال اُلٹ ہوگئی اب مسلمان یورپ اور جرمن یونیورسٹیوں میں علم حاصل کرنے جا رہے تھے اور وہاں سے صنعتی مصنوعات اور سائنسی علوم کے ساتھ مغربی تہذیب وثقافت مشرق وسطی منتقل ہو رہی تھی۔

یورپ سے مشرق وسطی اور اسلامی ممالک کی طرف اس بہاؤ میں جرمن قوم کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ ذہنی طور پر اسلامی دنیا سے منسلک تھی لہٰذا جرمنی تجارتی انداز میں مسلمانوں سے معاملات کرتا رہا جبکہ فرانس، اٹلی اور برطانیہ کو زمینی راستہ میسر نہیں تھا اُسے سلطنت عثمانیہ سے لڑائیاں لڑ کر شمالی افریقہ میں پاؤں جمانے پڑے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی، مشرق وسطیٰ، ایران، افغانستان تک جرمنی کا اثر ورسوخ بڑھ گیا جبکہ دیگر علاقوں میں فرانس، اٹلی اور زیادہ تر برطانیہ کا تسلط قائم ہوگیا۔

معاشی اور سیاسی پہلو

اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز (۱۸۰۱ء) تک یورپی اقوام صنعتی ترقی کے نتیجے میں فوجی لحاظ سے مستحکم ہوگئی تھیں، صنعتوں میں مشینی پیداوار سے بے پناہ تجارتی مال تیار ہوتا تھا جس کی کھپت درکار تھی اور صنعتوں کو چلانے کے لیے خام مال درکار تھا جو یورپ میں میسر نہیں تھا؛ لہٰذا ــــ یہ یورپی اقوام اپنی اغراض کے لیے تسخیر ممالک کے لیے نکل کھڑی ہوئیں۔ یہ یورپی اقوام ڈچ (پرتگال)، فرانسیسی (فرانس)، اطالوی (اٹلی)، انگریز (برطانیہ) اور جرمن (جرمنی) اقوام تھیں۔

ڈچ قوم بحر اوقیانوس کے کنارے ہی تھی لہٰذا اس نے جلد ہی مغربی افریقہ مشرقی افریقہ کے ساحلوں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت مغلیہ سلطنت مستحکم تھی لہٰذا یہ قوم انڈونیشیا، ملائیشیا کے بعض علاقوں پر جا قابض ہوئی۔

فرانسیسیوں کو شمال کی طرف سے برطانیہ سے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا اس نے جنوبی ساحل سے بحر اوقیانوس عبور کر کے شمالی افریقہ، الجزائر اور مصر کے علاقوں پر قبضہ جما لیا۔

اطالوی قوم نے بھی بحر اوقیانوس سے نکلنے کے لیے ڈچ، برطانیہ، فرانس سے مقابلہ کرنے کی بجائے لیبیا اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر کے افریقہ میں علاقے اپنے قبضے میں کر لیے۔

انگریزوں کو کھلا سمندر ملتا تھا لہٰذا یہ یورپ کے مغربی ساحل سے ہو کر افریقہ کے مغربی علاقوں اور

جنوبی علاقوں پر قابض ہوگئے پھر جزیرہ نمائے عرب کے یمن، اومان اور خلیج فارس میں اثر ورسوخ بڑھایا، بعدازاں بحیرہ ہند میں ہند کے ساحلی علاقوں پر قبضے کیے۔ مغلیہ سلطنت مضبوط تھی؛ لہٰذا ــــ انگریزوں نے بنگال میں جا کر ساحلی علاقے کو آباد کیا۔ فرانسیسی قوم نے بھی سندھ کا ساحلی علاقہ اور جنوبی ہند کا مشرقی ساحلی علاقہ قبضے میں لیا تھا تاہم جلد ہی انگریزوں سے جنگوں میں اُسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

پس پردہ قوتوں نے برطانیہ کوآگے بڑھتے دیکھا تو اس قوم کواشیر باد دے کر عالمی استعمار کا سب سے بڑا مہرہ بنا دیا۔ برطانیہ نے انیسویں صدی کے شروع میں جنوبی ہند سے فرانسیوں کو مار بھگایا (سلطان ٹیپو شہادت ۱۷۹۹ء بھی فرانسیسیوں سے صنعتی روابط رکھتے تھے) اور مصر سے بھی فرانسیسیوں کو نکال دیا اور نپولین بوناپارٹ کوشکست فاش سے دوچار کر دیا۔

مصر کی فتح کے نتیجے میں بحیرہ قلزم کوخلیج سویز جواوپر جا کرختم ہوتی ہےاور بحیرہ روم سےصرف ۱۸۰ میل دور رہ جاتی ہے، انگریزوں نے نہرسویز بنائی اور بحیرہ روم سے جہاز رانی کا راستہ بحیرہ قلزم اور بحیرہ ہند تک نکال لیا اس سے انگریزوں کو ہندوستان آنے کے لیے چار ہزار میل کا فاصلہ کم ہوگیا اور مقبوضات کی نگرانی آسان ہوگئی اورفوجی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ تاہم برطانیہ، فرانس، اٹلی، ڈچ سب اقوام جہاں جہاں گئیں انہوں نے لوٹ مار کی، مقامی باشندوں کو دبایا (جیسے برطانیہ نے امریکہ پہنچ کر مقامی باشندوں ریڈانڈین قوم کوسرے سے ختم کر دیا تاکہ اپنا تسلط پائیدار ہو سکے) اسی طرح بنگال وغیرہ میں انگریز، فرانسیسی اور اطالوی اپنے ان مقبوضات میں غاصب، لٹیرے، غیرملکی بدمعاش ہی سمجھے جاتے رہےاور مقامی لوگوں نے جلد یا بدیر آزادی کی تحریکیں چلا کر ان استعماری قوتوں سے آزادی حاصل کر لی۔

اس پس منظر میں معاشی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے جرمن قوم کا معاملہ بالکل منفرد ہے۔ اطالوی قوم کی طرح جرمن بھی تسخیر ممالک کی مہم میں شریک ہوئی تو اولاً اُسے صرف شمال کی طرف سمندر ملتا ہے جو سارا سال تجارت کے قابل ہی نہیں ہوتا پھر وہاں سے نکلتے ہی برطانیہ اور فرانس کے ساحلوں سے گزرنا پڑتا جس سے لڑائی اور جنگیں ناگزیر تھیں۔

یہ سہولت قدرت کی طرف سے جرمنی اور جرمن قوم کو ملی کہ اُسے جغرافیائی طور پر مشرق میں وسیع اسلامی دنیا کا ملحقہ علاقہ میسر تھا جہاں زمینی روابط صدیوں سے استوار تھے۔ تاریخی طور پر عثمانیوں اور ان کے زیرنگیں علاقوں میں پہلے بھی آنا جانا تھا، تہذیبی اور ثقافتی رشتے بھی موجود تھے لہٰذا ــــ جرمن قوم نے اس سہولت سے فائدہ اٹھایا اور مشرقی یورپ سے ہوتے ہوئے ترکی مشرق وسطی، سعودی عرب، ایران افغانستان تک تجارتی روابط بڑھائے۔ برطانوی اور فرانسیسی پیداوار کو مارکیٹ تک پہنچنے کے لیے ہزاروں میل کا سمندری راستہ طے کرنا پڑتا تھا پھر دشمن علاقے، آپس کی مسابقت اور مقامی طور پر لوگوں میں

غیر ملکیوں کی نفرت جیسے عوامل درپیش رہتے تھے۔اس کے مقابلے میں جرمن قوم کو مسلم ممالک میں ایک باوقار تاجر اور نئی نئی مصنوعات متعارف کرانے والی قوم کے طور پر پہلے سے جانے پہچانے لوگوں میں کام کرنے کا موقع میسر تھا۔اس صورت حال سے ان ممالک کے مسلمانوں میں جرمنوں کے لیے خیر سگالی اور احسان مندی کے جذبات موجزن تھے۔

معاشی اور سیاسی طور پر جرمن قوم کے مسلمانوں سے روابط اور تعلقات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ:

افغانستان میں احمد شاہ ابدالی (وفات ۱۷۷۳ء) کے دور میں جرمن اسلحہ اور تجارتی مال کا دور دورہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور پانی پت کے میدان میں تین لاکھ مرہٹوں کو شکست فاش سے دوچار کر دیا، احمد شاہ ابدالی کے ساتھ جرمن ساختہ توپیں تھیں جو جنگ میں کام آئیں انہی توپوں میں سے ایک لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے سامنے مال روڈ پر نصب ہے۔

ترکی میں جرمن مصنوعات عام تھیں اور شام، لبنان، اردن، فلسطین، عراق سارے علاقے جرمن مصنوعات ہی استعمال کرتے تھے، بڑے پراجیکٹ بھی جرمن کمپنیوں کے ذریعے اور جرمن ٹیکنالوجی پر ہی تکمیل پذیر ہوتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں استنبول سے شام، لبنان، فلسطین، اردن ہوتے ہوئے مدینہ اور مکہ تک ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ بنایا گیا اور اس پر عمل درآمد ہوا تو یہ منصوبہ بھی جرمن انجینئروں کے ہاتھوں آگے بڑھا۔ مدینہ تک ریلوے لائن بچھ گئی تھی اور مدینہ تک ریل گاڑیوں کی آمد ورفت شروع بھی ہوگئی تھی کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) چھڑ گئی جس سے کام بند ہوگیا، ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا، پھر جرمنی کی شکست کے بعد دوبارہ کام شروع نہ ہو سکا۔

سعودی عرب کے علاقے مکہ اور مدینہ میں ۱۹۹۵ء تک کی (نئے توسیعی منصوبے کے آغاز) تک گھروں میں حاجیوں کے لیے جرمنی طرز فٹنگز استعمال ہوتی تھیں۔

اس طرح جرمنی عالم اسلام کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھتا تھا اور اسی کا اثر تھا جو جرمن دانشوروں پر اسلام کی حقانیت اور فطری دین ہونے کی وجہ سے نمایاں ہو رہا تھا۔آج سے تین دہائیاں پہلے تک جرمن دانشور این میری شمل کا اقبالیات اور تصوف اسلامی کا مدّاح ہونا جرمن قوم میں اسی متوازن سوچ اور عالم اسلام سے سابقہ صحت مند روابط ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

صہیونی عزائم

صہیونیت ایک ادارے اور تحریک کے طور پر جس طرح واضح درجہ بندی (Cadres) کے ساتھ گزشتہ ایک صدی سے زیادہ عرصے سے دنیا کے سامنے ہے۔ اس طرح کی تحریک اور شناخت پہلے تو نہ تھی

مگر___ بنی اسرائیل کے ایک بگڑے ہوئے گروہ کے طور پر جس کے ابلیسی اور شیطانی عزائم قرآن پاک نے بڑے واضح بیان کیے ہیں وہ یقیناً بہت پہلے سے ہے اور اس کی تاریخ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرف سے ان کے ساتھ رویے سے جا ملتی ہے۔قرآن مجید___ ایک آسمانی کتاب ہےاور اس کتاب میں جس طرح اس ابلیسی گروہ کی نقاب کشائی کی گئی ہے وہ کسی اور کتاب میں ممکن نہیں ہے پھر دنیا میں جتنی بھی کتابیں اس ابلیسی گروہ کے کردار کا چہرہ دکھانے کے لیے لکھی گئیں وہ اس گروہ نے دنیا سے غائب کر دیں *The Secret Societies of the World* اور *The Pawn of the Game* طرح کی ہزاروں کتابیں دنیا سے ناپید کر دی گئیں حتیٰ کہ *The Hundred* جیسی کتاب جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کی گئی تھی اور ایک عیسائی نے لکھی تھی اسے بھی غائب کر دیا گیا۔اس گروہ نے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کردار کشی کو اپنا مشن بنا رکھا ہے۔(آج جو کچھ کارٹون اور خاکوں کی آڑ میں ہو رہا ہے اس کے پس پردہ یہی صیہونی ابلیسی گروہ یہود ہے) یہی گروہ___ قرآن مجید کو بھی دنیا سے غائب کرنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے مگر یہ خالق کائنات نے نازل فرما کر اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا ہے۔(''ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔الحجر آیت ۹) ورنہ صیہونیت کی طرف سے گزشتہ چودہ صدیوں میں اس ضمن میں ایک سے ایک بڑھ کر خوفناک سازشیں ہوئیں مگر کامیاب نہ ہوسکیں نہ آئندہ ہوں گی ان شاءاللہ۔اس صیہونی اور ابلیسی گروہ کے عزائم کا صرف دورِ حاضر کے اعتبار سے خاکہ درج کیا جارہا ہے جس گروہ نے مغربی اقوام کے عروج کو ذریعہ بنا کر اور انہی قوموں کو بطور آلہ استعمال کر کے اسلام کو ختم کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔اس کا نتیجہ کیا ہے وہ ایک الگ باب ہے۔

یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد ہونے والی ترقی سے اس صیہونی گروہ نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔۱۶۰۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی جس سے ہندوستان میں تجارت کی آڑ میں برطانوی قبضے اور توسیع کا پروگرام بنا۔

اس ابلیسی گروہ نے اپنے منصوبوں کی کامیابی کے لیے مسیحیت کو فرنٹ مین کے طور پر استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا مگر مسیحیت میں 'پوپ' کا اصل اختیار تھا اور 'یہود' کو کام کرنے کی آزادی نہیں تھی۔اس گروہ نے طویل تحریک چلا کر مسیحیت میں ہی پروٹسٹنٹ کے نام سے ایک فرقہ کھڑا کر دیا جو آسمانی ہدایت میں لبرل ازم اور سیکولرازم کا قائل تھا، اسی گروہ کے ذریعے سود حلال کر دیا گیا اور بینکوں کا نظام قائم ہوا، ۱۶۴۵ء میں بینک آف انگلینڈ قائم ہوا اور بعد میں یہ سلسلہ یورپ اور ساری دنیا میں پھیل گیا۔

روایتی عیسائیوں کو کیتھولک نام سے پوپ کے ساتھ منسلک سمجھا گیا اور اس فرقہ کی بھی ہر طرح سے سرپرستی کی گئی۔

مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا گیا، پوپ کا اختیار صرف مذہبی معاملات تک تھا جبکہ برطانوی بادشاہ کو سیاسی طور پر مسیحیت کا محافظ (Defender of Faith) قرار دیا گیا۔ اس طرح تاج برطانیہ کو مسیحیت کے تحفظ اور حکومت برطانیہ کو پروٹسٹنٹس کے فروغ کا ذریعہ بنا دیا گیا۔

برطانوی مقبوضات سب سے زیادہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے، سائنسی ایجادات سب کی سب اس عالمی حکومت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے 'ضرورت ایجاد کی ماں ہے' کے اصول پر سامنے آئیں۔ ریل، برقی تار، سمندری سفر کی سہولت وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا بعد ازاں یہی ترقی ریڈیو، ٹی وی، کلر ٹی وی، وائرلیس، کمپیوٹر اور ہوائی سفر نے اس عالمی حکومت کے قبضے کو جاری رکھنے کے لیے آسانی پیدا کر دی۔

جرمنی کے عالم اسلام سے زمینی رابطے، تاریخی، ثقافتی اور برادرانہ تجارتی تعلقات اور باہمی اعتماد اس صہیونی گروہ کے سینے میں تیر کی طرح پیوست تھے۔ ۱۸۹۷ء میں صہیونیت باقاعدہ ایک تحریک اور ادارہ Organisation کے طور پر سامنے آ گئی یہودی دانشور نے سوئزرلینڈ کے شہر Basel میں کانفرس بلا کر یہود کے لیے مشرق وسطی میں ایک وطن کا خاکہ پیش کیا جس کا نام اسرائیل تجویز ہوا اس وطن کے حصول کے لیے ایک صد سالہ منصوبہ بنا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں یہود کی شکست کے سات صدیوں بعد انہیں ایک سنہری موقع مل رہا تھا۔ فلسطین (سمیت سارا مشرق وسطی) سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا یہ سلطنت پانچ صدیوں کے اقتدار کے بعد اب مضمحل ہو کر لڑکھڑا رہی تھی لہٰذا ایک جنگ کا منصوبہ بنا۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ اور جرمنی آمنے سامنے آ گئے۔ عثمانی حکومت جرمنی سے روابط اور دوستی کی وجہ سے اس کے ساتھ ہو گئی۔ جرمنی نے بڑا زوردار مقابلہ کیا مگر منصوبہ سازوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق (جس کی تفصیلات بھی تاریخ میں محفوظ ہیں) جرمنی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اب جرمنی اور ترکی کو ہارنے والے فریق کے طور پر سزا ملی اور سارا مشرق وسطی اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ فلسطین پر ۱۹۱۷ء کے بالفور ڈیکلریشن سے یہود کو ۶۴۴ء میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فلسطین فتح کرنے کے بعد اب داخلے کی اجازت ملی تھی۔

جرمنی پر اسلام اور کے جو کچھ اثرات باقی تھے اور دوبارہ منظم ہونے کی اس کے اندر سکت تھی اس کو دوسری جنگ عظیم میں تہس نہس کر دیا گیا تاکہ یورپ میں صہیونی لابی کا کنٹرول ہو (جو اب متحدہ یورپ ایک حکومت ایک پارلیمنٹ ایک کرنسی کے ذریعے سامنے آ چکا ہے) اور جرمنی کو تقسیم کر کے دیوار برلن تعمیر کر دی گئی تاکہ جرمنی عالم اسلام سے کٹ جائے اور مکمل طور پر Westward Looking ہو کر رہے۔

یہ وہ جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی عوامل ہیں جن کے اثرات جرمنی کو منوّر کر رہے تھے جن کا مشاہدہ حضرت علامہ اقبال نے ۱۹۰۵ء۔۱۹۰۷ء میں قیام یورپ میں کیا تھا اور تحریک مشرقی سے متاثر ہوئے

تھے اور پیام مشرق کے نام سے ایک مجموعۂ کلام بھی تخلیق کر دیا مگر صہیونی لابی نے اس پھول کو کھلنے نہیں دیا۔ پیام مشرق (مطبوعہ ۱۹۲۴ء) میں علامہ اقبال نے واحد آزاد مسلمان ملک افغانستان کے فرمانروا امان اللہ خان کو مخاطب کر کے ملت اسلامیہ کی بیداری اور خلافت اسلامیہ کے احیا کے لیے بہت سی تجاویز دی تھیں اور ان سے بہت سی توقعات بھی وابستہ کی تھیں۔ ۱۹۳۳ء میں سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال اور سر راس مسعود دورۂ افغانستان پر تشریف لے گئے تھے۔ قیام کابل کے دوران حکومتی اور ملکی معاملات کے علاوہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور خلافت اسلامیہ کے احیا کے لیے تجاویز بھی زیر بحث آئیں اس وقت نادر شاہ کابل کا حکمران تھا۔

اس سے پہلے علامہ اقبال ۱۹۲۷ء میں مدراس کی ایک مسلم انجمن کے زیر اہتمام الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید (*The Reconstruction of Religious Thought in Islam*) کے موضوع پر لیکچرز میں دور حاضر میں اسلام کے غلبے اور احیائے خلافت کے بارے میں اعلیٰ علمی فلسفیانہ سطح پر گفتگو کر چکے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں برطانوی ہند کے شمال مغرب میں ایک خطے میں مسلم ریاست کا تصور بھی دے چکے تھے جہاں اسلام کو نافذ کر کے اسلام کی تعلیمات کی برکات کا ایک نمونہ دورِ حاضر میں دنیا کے سامنے رکھا جائے۔

اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردانہ تعلقات اور صدیوں کے دوستانہ رویوں کی وجہ سے جرمنی میں عوامی سطح پر اسلام کے حق میں ایک لہر آج بھی موجود ہے اور اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس رُخ پر مزید تحقیق سے اس تحریک مشرقی کے اثرات کا مزید گہرائی میں جا کر جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال کی دوررس نگاہ نے اس کا مشاہدہ کر لیا تھا اور کوئی عجب نہیں کہ آنے والے وقت میں اس کا کوئی عملی نمونہ بھی سامنے آ سکے اور جرمن قوم کا Elite طبقہ مشرف بہ اسلام ہو جائے۔

❀...❀...❀